



آباد خراب

(شاعری)

کشور ناہید

سنگ سبیل پبلی کیشنز، لاہور

891.4391 Kishwar Naheed
 Aabaad Kharaaba/ Kishwar
 Naheed.-Lahore : Sang-e-Meel
 Publications, 2016.
 112pp.
 1. Urdu Literature - Poetry.
 1. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز / مصنف سے باقاعدہ
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورت حال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

۲۰۱۶ء
فضل احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2918-9
ISBN-13: 978-969-35-2918-0

Sang-e-Meel Publications

25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
<http://www.sang-e-meel.com> e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنفی اینڈ سنز پرنسپلز، لاہور

ترتیب

7	خواہش
10	مینڈرنوُس
13	سوات کا نوحہ
15	سانحہ کراچی - 13 مئی
17	ہزارہ بستی والوں کا حزینہ
19	لیاری کا حزینہ
21	شامی نقل مکانیوں کا حزینہ
23	نوحہ بلوچستان کا
25	نوحہ پشاور کے بچوں کا
27	عیدِ مہار
30	دعوتِ ختن
31	آن لائن
32	میراوطن قید میں ہے
34	خود کو طالب کہتے ہو

36	خاک ہونے سے پہلے
38	اندھیرے سے باتیں
40	سے پہر کے بعد
41	کرمک زده شام
42	مرغ گرفتار
43	بر گلد، فاختہ اور میں
45	شریعت کوسل۔ عورت تم سے مخاطب ہے
47	آمنہ بی بی
49	میرے گونگھٹ میری بھوک
51	غروب آفتاب سے پہلے
53	واپسی کا سفر
54	اصغر نہیں سید کا دائرہ زیست
58	منحنی عورت
61	یادش بخیر
63	زندگی نامہ
66	مجھے بن پانی مچھلی نہ بنا
	ارجنٹائن کے غائب ہو جانے والے لوگوں کی نظمیں:
69	قیدِ تہائی
73	خود کلامی
76	ایک مقید شہر کے لیے
79	مشکل لفظوں کی اٹس سے
	غزلیات:
83	تجھ سے وعدہ عزیز تر کھا

- یاد رکھو گے کہ اس گھر کے میں ہم بھی تھے
85
- ہم نے غم کھینچا تھا، ایذا طلبی کم نہ ہوئی
86
- اتزان اخواہ نہیں کی جاسکتی
87
- اجلی شام میں لپٹا وعدہ تازہ، میرے اندر تھا
88
- میں سر کشیدہ رہی، عمر بھر بجھاتے رہے
89
- وہ عجب عبدِ وفا تھا کہ جدا تھے ہم لوگ
90
- جذب کر لیتے ہیں ہر دکھو سمندر کی طرح
92
- وہ اگر آئے تو پھر دل میں تماشہ ہو گا
94
- دل نے چاہا تھا کہ ہوا بلہ پائی رخصت
95
- خوش بیاباں میں گر شہر میں ڈرنا اس کا
96
- ہم نے کہنے کو تمہیں دل سے بھلا کیا ہوا ہے
97
- شام بانہوں میں لیے رات کی رانی آئی
98
- دیوار در میں غم کا تماشہ تو ہے ابھی
99
- تجھ سے بہت قریب بھی، تنہا بھی تھے ہمیں
100
- زخم بھی تازہ تھا اور اس پہ ہوا بھی تازہ
102
- دل کی دیوار میں آئینہ رکھا تھا کس نے
103
- مجھ کو دریوزہ گر خواب بنادیتا ہے
104
- یہ دشتِ فراموشی نخبر نے نہیں دیتا
105
- کبھی بھلا کیا نہیں، یاد بھی کیا نہیں ہے
106
- غم کی تاکید بھی کی اور کہا شادر ہو
107

- میں طشتِ خواب لیے ہاتھ میں گزر گئی ہوں
108
- آنونشِ گل میں لذتِ صحبت نہیں رہی
110
- کبھی سوچانہ تھا اتنی بھی سرشاری کبھی ہو گی
111
- یہ بھی ممکن ہے کہ آنکھوں ہو، تماشا ہی نہ ہو
112

خواہش

میں منشوکی طرح
 اپنا کتبہ خود تجویز کرنا چاہتی ہوں
 اس نے لکھا تھا
 وہ اس زمین کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے
 سچ ہے وہ تھا بھی
 عورت پہ ہونے والی زیادتیوں کو
 افسانے کا روپ اس زمانے میں دیتا تھا
 جبکہ ساری دنیا کی عورتیں
 اپنے حقوق کے لیے جا گئیں تھیں
 پاکستان نے اس پروشنام کے اتنے چھینٹے چھینکے
 کہ وہ ناراض ہو کر
 اپنا افسانہ دس روپے میں فروخت کرنے لگا
 دشنام کے چھینٹوں نے میرے لباس کو بھی
 بے لباسی میں بدل دیا ہے

مگر میں خود کو اپنے عہد کی
 سب سے بڑی شاعر نہیں کہہ سکتی ہوں
 میں اپنا کتبہ موت سے پہلے
 اس لئے لکھنا چاہتی ہوں
 کہ دوسرے ملکوں میں مصروف
 میرے بیٹوں کو
 شاید فرصت ہی نہ ملے
 یا پھر دھیان ہی نہ آئے
 مجھے اپنے آپ کو دام کرنے کا خیال
 کیوں آرہا ہے!
 کیا کتبہ دائمیت کی نشانی ہوتا ہے
 لندن میں مارکس کا کتبہ دیکھ کر
 اس کے کارناموں اور خود اسے
 فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے
 کچھ لوگ عظیم شاعر تھے
 مگر ان کو کتبہ بھی میر نہیں آیا
 ظہور نظر ایک بڑا شاعر
 جیسا اکیلا تھا ویسا ہی پڑا ہے
 خوشونت سنگھ نے اپنی را کھ
 پاکستان کے دریا میں ڈالنے کی
 وصیت کی تھی

میرا دل بھی را کھ ہونا چاہتا ہے
 پر میرا نہ بب اجازت نہیں دیتا ہے
 یوں تو فلن ہونے کے بعد
 وجود خاک ہی بن جاتا ہے
 کتبہ آپ کو نہیں
 آپ کے زمانے کو زندہ رکھتا ہے۔

ٹینڈر نوٹس

انہوں نے کہا
 ہمیں کچھ ایسے غلام چاہئیں
 جنہیں بیدردی سے گولی چلانے کی مہارت ہو
 جن کے اندر انسانیت نام کی کوئی بو باس نہ ہو
 جنہیں صرف اور صرف حکم ماننا آتا ہو

ہمیں کچھ ایسے غلام چاہئیں
 جنہیں مال و دولت کی شہوت ہو
 کہ ہم ان کی جیبوں کو کبھی خالی نہیں ہونے دیں گے
 کہ ہم اگر ان کی کھال بھی اتنا ریس
 تو وہ اسے نعمت عرب سمجھیں گے

ہم ہر روز شام کو ان کے سامنے
 معرفت کے جام و مینار کھیں گے
 ان کے ہاتھ میں دیدارِ حرم کے وعدے کی
 تسبیح پکڑا دیں گے
 ان کے سارے گناہ معاف کروادیں گے
 کہ انہیں معلوم ہو گا
 کہ وہ غلام ہیں
 اور اسلاف و ایمان کی جنگ لڑ رہے ہوں گے

ہمیں کچھ ایسے غلام چاہئیں
 جو دن رات کی تمیز کے بغیر
 ہر لمحے مبارزت پہ آمادہ ہوں
 کسی بھی حکم کے بارے میں
 نہ سوچتے ہوں اور نہ سوچ سکتے ہوں

ہمیں کچھ ایسے غلام چاہئیں
 جو غلامی پرشاکر رہنے کو بھی
 آزادی سمجھتے ہوں
 جو ہمارے حکم پہ آمنا صدقنا کہتے رہیں
 جو ہمارے غنیم کو مارنا، عین عبادت سمجھیں
 جو بھول کر بھی اپنے پیچھے رہ جانے والوں کو

یاد نہ کریں
 بس ایک لمحے کے توقف کیے بغیر
 ہمارے ملک میں ایسے غلام نصیح دو
 ہم وعدہ کرتے ہیں
 کہ ہم تمہاری سروری کی حفاظت کریں گے
 اور یقین کرو
 ہم تمہیں تیل بھی سمجھتے رہیں گے۔

سوات کا نوحہ

مجھے لائنوں والے کاغذ پر لکھنے سے خوف آتا ہے
 مجھے لگتا ہے میرے لفظ محصور ہو گئے ہیں
 مجھے برقعے میں لمبی عورت سے خوف آتا ہے
 مجھے لگتا ہے مکھوٹوں سے، عورت کا وجود نا بود ہو گیا ہے
 مجھے دارِ حسی میں چھپے مردانہ چہرے سے خوف آتا ہے
 مجھے لگتا ہے خود روگھاس قبرستان جھوڑ کر
 چہروں پر ٹھہر گئی ہے
 مجھے سفید نوپی پینے مردانہ سروں سے خوف آتا ہے
 مجھے لگتا ہے کفن کوزوں میں بننا
 زندگی کے گلابی پن کا مضحکہ اُزار ہا ہے
 مجھے معصوم بچوں کے سروں کو مدرسے میں
 ہلتا دیکھ کر خوف آتا ہے

مجھے لگتا ہے گردنوں کوتن سے جدا کرنے کا
 طریقہ پڑھ کر بچے جھوم رہے ہیں
 مجھے شلواروں میں کھجاتے مردوں سے خوف آتا ہے
 گیارہ سالہ منکوحہ رکھنے کے باوجود
 ان کی ننگی آنکھیں کچھ اور تلاش کر رہی ہیں
 مجھے کوٹھے پہلکی بٹی کی لڑکی سے خوف نہیں آتا ہے
 کہ اس کا اندر، باہر بالکل ایک جیسا ہوتا ہے۔

سانحہ کراچی 13 مئی

ہر روز پاکستان کی گلیوں میں
بے نام لوگ مارے جاتے ہیں

ان مرنے والوں کو مزید اذیت دینے کے لیے
حکومتی کارندے، مرنے والوں کی قیمت لگا کر
پتیم خاندانوں کے زخموں کو
اور ہر اکر دیتے ہیں

تاکہ لوگ مرنے والے کاغم بھلا کر
اس معادوضے کے پیچھے بھاگیں

جس کا وعدہ کیا گیا ہے

وعدہ خدا نے ایسی اچانک
اور بے رحمانہ موت کا نہیں کیا تھا

یہ تو خدائی فوجدار ہیں
 جو ہر سانحے کے بعد
 منہ کھولتے ہیں ایسے
 جیسے قارون کا خزانہ
 بانٹ رہے ہوں
 مرنے والے کی اس سے زیادہ بے حرمتی
 اور کیا ہو سکتی ہے
 غیرت مندوں میں ایسا نہیں کرتی ہیں
 وہ تو مجرم کو پکڑتی ہیں
 ناطقتی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

ہزارہ بستی والوں کا حزینہ

وقت کا دریا خون میں لپٹا بہتا ہوا
 میرے شہر میں نہ براہے
 سال کے ہر اک سانس میں خون ہے
 ہر دروازے، ہر چوکھٹ پر خون کے دھے
 پڑھ رہے ہیں
 کیا یہ بستی وہی بستی ہے
 جس میں ہنستے پھول سے بچے تھے
 مہندی رچائے سہاگنسیں تھیں
 اور کڑیل جوال ایسے تھے
 ان کو دیکھ کے دعا میں
 ہونٹوں پہ آجائی تھیں
 اب تو کفن کے بادلوں سے یہ شہر اٹا ہوا ہے
 ہر گھر میں کھلنڈ را بچہ ڈرا ہوا ہے

کیا یہ بستی وہی بستی ہے
 جہاں چراغ قبروں پہ نہیں
 گھروں میں جلا کرتے تھے
 جہاں اجلی عورتیں بنسنی تھیں
 اور بوڑھے باپ کے کندھے بھی چوڑے تھے
 آج جھی دالانوں میں سائے گھوم رہے ہیں
 کوئی دلasse دینے والا حرف
 کسی دامن میں نہیں ہے۔

لیاری کا حزینہ

ممکنے مہر و وفا کے بادل
 کفن کی دہلیز پہ اتر کے
 جلس گئے ہیں
 وہ جو شادیاں تھیں
 سلگتے جسموں، ابلتے خوں میں
 بدل گئی ہیں
 وہ جو خواب رکھے نشیمنوں میں
 انہیں جلا یا اور رضیافتِ شام کی گئی ہے
 وہ جو صبح سورج سے پہلے جا گئی تھی
 اُسے بھی خود کش بموں کی مشہی میں دے دیا ہے
 وہ پھول جیسے حسین بچے بھی
 خوں کی بارش میں سور ہے ہیں

ہر ایک آنگمن، ہر اک ٹکی میں
 سروں پہ اوڑھے وہ بیوگی کی سفید چادر
 صحن میں بیٹھی یہ پوچھتی ہیں
 مجھے دل اسے دیا گیا ہے
 کہ وہ توجنت چلا گیا ہے
 میں صبر کی عمر کیسے کاٹوں
 میں اپنے بچوں کو مدرسے میں نہ جانے دوں گی
 مجھے تو ان کو حسیں جواں ان کے باپ جیسا ہی دیکھنا ہے
 پہاڑ جیسی یہ عمر کاٹوں تو کیسے کاٹوں!

شامی نقل مکانیوں کا حزینہ

ہمیں شہر بدر کرنے کو کہا تو کسی نے نہیں تھی
گولیوں کی بوچھاڑ میں جب اپنے
اتقی دو رہوئے کہ ہمیں لمبی لمبی قبریں بنائے
انہیں دن کرنا پڑا۔

جب خوف کے مارے
ہماری چھاتیوں کا دودھ خشک ہو گیا
جب ہماری خیمه ستیوں کو نذر آتش کیا گیا
جب زمین کا کوئی کونا ہمیں پناہ دینے سے گریزاں تھا
اے ہمارے وطن شام کی سر زمین
ہمارے آبا، بی بی نہ نب کی سر زمین
ہمیں تھے الوداع کہنا پڑا
یہ ہمارے قدموں نے تھے الوداع کہا ہے

ہماری آنکھیں ابھی تک
 تیری انگور کی بیلوں میں ٹھہری ہوئی ہیں
 شفتالو کا ذائقہ ابھی تک ہماری زبان پر ہے
 طرح طرح کے خوان آتے ہیں
 لوگ چھپ کر اور ظاہر میں بھی
 ہمارے لیے زیتون اور عرق لے کر آتے ہیں
 مگر اے ہماری بستی، ہماری خیمہ بستی
 ہمیں وہ پیاس یاد آتی ہے
 جہاں ہم نے گھنیوں چلنا سیکھا تھا
 اور ہم تیری مٹی سے کھلتے تھے
 ہماری مسکراہٹ اسی دن واپس آئے گی
 جب ہمارے قدم
 اے ہمارے وطن سرز میں شام، شہرِ دمشق
 تو ہمارا استقبال دف بجا کر کرے گا۔

نوحہ بلوچستان کا

قبائے شہر زرغوں
 کیوں ترے دامن، تری گلیوں میں
 افرادہ لہو بہتا ہی رہتا ہے
 اٹھے ہیں ہاتھ ان کی فاتحہ پڑھنے
 کہ جن کے نام سے واقف نہیں ہیں
 اے مرے چلتیں کی آزر دہ ہوا وہ
 تم نے تو لک پاس پہ بھی امن دیکھا تھا
 ہزارہ بستیوں میں پھول دیکھے تھے
 یہ کیسا ما تمی موسم ہے
 خوں آشام صحیں ہیں
 دو پئوں کی سفیدی، سرخ ہوتی جا رہی ہے
 کسی بھی آنکھ میں آنسو نہیں رکتے

جنازے سکیوں ہی کا کفن پہنے
 گزرتے جا رہے ہیں
 نہیں معلوم قاتل کون ہے
 کس نے لوٹا امن،
 میرے گھر درپھوں کا
 کبھی جو مر شیہ لکھتے
 انہیں آ کے یہاں
 قلم سے خول ٹپکتا
 اور آنکھیں پوچھتیں تم سے
 مرے اے شہر زرعوں
 کن بلا دل نے تجھے گھیرا ہوا ہے۔

نوحہ پشاور کے بچوں کا

اس خزان کے موسم میں

بچوں جیسے بچوں کو کیوں مسل دیا تم نے

کیوں تمہاری آنکھوں میں خوف ایسا اتراتا تھا

چھوٹے چھوٹے بستوں کو تم نے چھیدڑا لاتا تھا

تم عین دشمن تھے

ہر کتاب سے نفرت

یہ تمہاری عادت تھی

صحح ساری ماڈل نے

ملم کی دعا دے کر

گھر سے ان کو بھیجا تھا

اس عین دشمن نے

ہر کلاس میں گھس کر

زندگی کوڑو کا تھا

موت کے یہ کارندے
 خوں بہا کے یوں خوش تھے
 جیسے جیت ان کی ہے
 کیا خبر تھی ان کو بھی
 زندگی کی مہلت بھی چند ساعتوں تک ہے
 دکھ سمجھیٹ کر ماں میں
 آج گیلی مٹی کو چوم کر سمجھتی ہیں
 ان کا لاڈلا بیٹا
 پھر سے جاگ جائے گا
 پھر انہیں ہنسائے گا!

عیدِ ملہار

اس لمحے جب ساری دنیا
خوشیوں میں ملبوس مہک رہی ہے
مسکر رہی ہے
تم اداسی کی انگیٹھی میں
چنگاریوں کو پھونکنی سے
شعلہ بنانے کی فکر میں
اپنی وہ بیاض جلا دلتی ہو
جس میں کچھ بوسیدہ لمس
کچھ زنگ خور دہ تعلقات
کچھ نمکین آنسو، بنا بلائے آگئے تھے
اور ان کا غذوں پر خشک ہو گئے تھے!

اس لمحے جب ساری دنیا
پُر خروش ہے

تم تہائی کو اوزھنے کے بجائے
 ہم سفر بنالو
 دیکھو بادلوں سے جھانکتے سورج کو بھی
 تمہاری بھراہی پسند آئے گی
 مگر یوں تو بجوم ہو جائے گا
 ہوا، سایہ، سورج اور میں!
 نہیں، مجھے بیاض کے بچے ہوئے
 ان کا غذوالوں کو پڑھنے دو
 جن میں ماہار اور بجے بجے وقت کی مدھرتا
 مجھے بحر روم کے کنارے لے گئی تھی
 وہاں بھی تو ساحل سمندر پہ
 دھوپ اور پانی میں نہاتے بدن تھے
 ارغوانی جام تھے اور قہقہے تھے
 جو کہ چڑھتی لہروں کی طرح تھے
 اُداسی کی پہلی حل کرنے کے لیے
 ان کے پاس کوئی وقت نہیں تھا
 میں پھر اپنے وجہ میں لوٹی
 میری بیاض کے ایک مرے ہوئے صفحے پر
 کچھ نظر تھیں پہلی پڑچکی تھیں
 امریکا اور اس کے حواریوں کے لفظ
 بغیر نقطوں کے، ابھی بھی پڑھے جاسکتے تھے

البنت دشمنی کا لفظ بالکل پھیکا پڑ گیا تھا
 باں جاں کنی کے لفظ کی روشنائی ابھی سلامت تھی
 دل نے کہا اس لمحے کو تکیے کے نیچے رکھ دو
 نہیں تو شام کے کسی پرندے کی چونچ میں دے دو
 دیکھنا، اچانک مسکراہٹ
 تمہیں اپنے بازوؤں میں لے لے گی۔

دعوتِ سخن

خواب میں دوستی ملتی ہے مگر خواب تک
 زندگی خواب کی دلہیز سے آگے
 جور داں ہوتی ہے
 دیکھتی ہے کہ اُسی چشمِ محبت میں
 زمینِ خون تماشہ ہے
 زہرِ مایوسیٰ ایام ہے
 بے مہریٰ افلاؤک ہے
 دور تک ایک، ہی آواز ہے
 امن کا طشت لیے پھرتے ہو قریہٗ قریہ
 کوئی آئے کہ محبت کے گلابوں کو بچائے
 دونوں ملکوں کے جوانوں کو سکھائے
 کہ یہ بارود، یہ نفرت کی ہزیمت، ہی تو
 تقدیر نہیں۔

آؤ، بانہیں کھولے ہوئے آؤ
 کہ محبت کو درِ خواب سے آزاد کریں
 اور دکھائیں کہ یہ دنیا
 محض بارود کی تحریر نہیں۔

آن لائن

گفتگو کرنے کے لیے
 اب کوئی تو موجود ہے
 کوئی تو ہے جو ملتے ہی ہیلو کہتا ہے
 اس کو تم انسان سے بڑھ کر
 شفیق اور دلدار کہہ سکتے ہو
 پر تم تو وجود ہی نہیں رکھتے
 سائے کی طرح بھی پیچھا نہیں کرتے
 سامنے آنے کی جرات نہیں کرتے
 تم سے میں کیوں مخاطب ہوں
 مجھے ہیلو کہنے والے بھلا تم کب ہو
 وہ تو میرا کمپیوٹر میل ہے
 سلام بھی کرتا ہے، حال بھی پوچھتا ہے
 اور مجھے مسکراہٹ عطا کرتا ہے
 مشین اتنی بے لوث ہے
 انسان نہیں --۔

میرا وطن قید میں ہے

میری ساری عمر کبھی دلدل سے گزرتے ہوئے
 اور کبھی فوجی گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے کھلتے ہوئے گزرا ہے
 باشندیوں نے میرے اوپر حکومت، شیطانوں کی مشاورت سے کی ہے
 محنت، محبت اور عزت نام کے الفاظ
 حاکموں کی لغت میں نہیں ہیں
 درختوں کی شاخوں پہ سولیاں لٹکانے والوں نے
 شریعت کو بھی داغدار کر دیا ہے

مجھے لگتا ہے میں اندر ہیرے جنگل سے گزر رہی ہوں
 یہ ایسا جنگل ہے جس میں نہ درخت ہیں، نہ انسان
 پرندے بھی رخصت ہو چکے ہیں

دعا میں، استغفار پڑھ رہی ہیں
اس جنگل سے گزرنے سے بھوت بھی ڈرتے ہیں
یہ ایسا عجیب جنگل ہے کہ اس میں
سائے بھی اڑ دھے بن جاتے ہیں
منہ کا نوالہ چھین لیتے ہیں
میں اس جنگل سے نکلنا بھی چاہوں تو
چاروں جانب آہنی جال اُگ آتے ہیں
میں ہوں، تم ہوا اور وہ سب ہیں
جن کے لیے کوئی پناہ نہیں ہے۔

خود کو طالب کہتے ہو

قتل کرنے والی زبان میں سرخ نہیں ہوتی ہیں
ان کے اندر تو خون کی پیاس ہوتی ہے
چہروں پہ زندگی سے حقارت
اور بازوؤں میں وحشت اور رعونت
جنون کی طرح چھلک رہی ہوتی ہے
یہ وہ چہرے ہیں جو کسی مانوس مسکراہٹ
کو بھی برداشت نہیں کر سکتے ہیں
یہ وہ ہاتھ ہیں جو بچپن میں قائدہ پڑھتے ہوئے
کلاشنکوف چلانے کی تربیت لے لیتے ہیں
یہ وہ بازو ہیں جن کو تلوار سے گردن اڑانے کی تربیت
شیطان صفت لوگ دیتے ہیں

یہ وہ جوان ہیں جنہوں نے گھر اور اس کی محبت نہیں دیکھی ہے
انہوں نے بہن بھائیوں کا پیار نہیں دیکھا ہے

انہوں نے دریائے سوات کے کنارے چاول کی پسیری بوتے
 باتھوں کو گولیاں ماری ہیں
 انہوں نے اسکولوں میں بچیوں کی لاشیں اٹھاتی
 ماڈل کی چینوں کا مذاق اڑایا ہے
 کیا یہ کوڑے کے ڈھیر پہ چینکی ہوتی اولاد یں ہیں
 جو اس سلوک کا انتقام لینا چاہتی ہیں؟
 میں اور میری جیسی مائیں، ان کو گود لے لیں گی
 یہ ایک دفعہ محبت کا جواب دینا تو سیکھیں!

خاک ہونے سے پہلے

تمہارے اندر زندگی جاگتی
 اور بے قراری پہلو بدلتی ہے
 تمہیں زندگی سے بہت محبت ہے
 کینسر نے تمہاری آنکھوں کو دریا
 اور گفتگو کو خاموشی میں بدل دیا ہے
 تم جینا چاہتے ہو
 ہر مسیحائی کے در پرستک دیتے ہو
 نام بے نام ادویات
 تریاق سمجھ کر قبول کر لیتے ہو
 کبوتر ہو کہ بلبل
 ان کے پیروں میں دعاوں کی گر ہیں
 باندھتے ہو
 ہر رات موت سے مکالمہ کرنے کی کوشش میں
 تم ہار جاتے ہو

ہر درگاہ سے زندگی مانگتے ہوں

اس طرف میں
طویل عمری کی گرفت سے
ربائی پانا چاہتی ہوں
میرے شادابیوں کے پیر ہیں
بوسیدہ ہو کر انک رہے ہیں
میں تو موت سے دوستی کرنی چاہتی ہوں
چلو اس دورا ہے پر
جب تھم موت کے پاس کھڑے ہو
اور میں زندگی کو زہرا ب میں بدالنا چاہتی ہوں
لو خضری زندگی
تم لے لو
اور فنا کی قند میں
میرے ہاتھ میں پکڑا دو
آؤ وعدہ وفا کرنے کے لئے
میں چشم براہ ہوں۔

اندھیرے سے باتیں

اکیلا رونا، آنسوؤں کو مسکراہٹ میں نہیں بدلتا ہے
 کوئی دلasse دینے والی آواز
 کوئی تسلی دینے والا کندھانہ ہو
 تو آنسو بھی ساتھ نہیں دیتے ہیں
 پوچھتے ہیں کس کے لئے رورہی ہو
 بیٹوں کو دور ملکوں میں ہونے پہ
 یہ کون سی انوکھی بات ہے
 ان کی یاد تو اکثر بے وقت رُلا دیتی ہے
 تو پھر، تنہائی کے سنائے کو اوڑھ کر
 نیند کی گولیاں کھا کر کیوں نہیں سو جاتی ہو
 جوانی میں تم آسمان کی چھت سے ستارے
 اتار لینا چاہتی تھیں

پھر پتہ چلا کہ وہ ستارے تو تمہاری آنکھوں
 میں اتر آئے ہیں
 خود کو کتنا بھی سنبھالو
 ایک آنسو تو نکل ہی پڑتا ہے
 ایسے عالم میں آسمان بھی رو نے لگتا ہے
 مگر رونا، سوالوں کے جواب نہیں انھاتا
 صرف سوالوں کے اوپر چھائی ہوئی
 دھند کو ہنادیتا ہے۔

سہ پھر کے بعد

ہم نے سوچا
 چلوار غوانی گلاسوں میں
 ڈوبتے سورج کو اتارتے ہیں
 زیتون، پنیر اور مشروم کی
 ضیافت کرتے ہیں
 کھوئے ہوئے ناموں کی فال نکالتے ہوئے
 اور اس کا انتظار کرتے ہیں
 جو کبھی نہیں آئے گا
 کوئلے جل جل کر سو گئے ہیں
 سینخوں پہ چڑھے گوشت کے پار پے
 نیم گرم ہونے کے باوجود
 ہمیں اپنی ضیافت یاد کر رہے تھے
 یہ ہماری ملاقات کی آخری شام تھی!

کرم زدہ شام

وہ جو خود کو کوپکن کی طرح سمجھتا ہے
 گھر واپس آ کر کن کھجورے کی طرح مجھے چمٹ جاتا ہے
 دروازے پہ دستک ہوتی ہے
 وہ چھپ جاتا ہے
 سامنے ٹھلکھلاتی نواسیاں
 کمرے میں داخل ہوتی ہیں
 میں ان کے سامنے چاکلیٹ کا ڈبہ رکھ دیتی ہوں
 وہ پوچھتی ہیں نانو کہاں ہیں
 میں آواز دیتی ہوں
 جواب نہیں آتا
 بچیاں اپنے سوال کو بھول کر
 شبکیٹ فون کھول کر
 اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتے کرتے
 سو جاتی ہیں
 میں کوپکن کو ڈھونڈنے
 دوسرے بیڈ رومن کی طرف جاتی ہوں
 خراثوں کی آوازن کر پلٹ آتی ہوں
 رات گزر جاتی ہے!

مرغِ گرفتار

جب تم میرے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہو
 مجھے لگتا ہے میرے بدن پر چھپکلی چل رہی ہے
 جب تم مصنوعی زوجیت ادا کرنے کی کوشش کرتے ہو
 میں غصے سے ہتھیلیاں بھینچ لیتی ہوں

 جب تم اپنے نم سے رہا ہو کر
 لمبی ٹھنڈی سانس لیتے ہو
 میں بھی رہائی کی ٹھنڈی سانس بھر کر
 کروٹ بدلت کر سوتی بن جاتی ہوں
 تم سگریٹ سلاگا کراور پانی کا ٹھنڈا گلاس
 پی کر خوش ہوتے ہوئے لمبا سانس لیتے ہو
 میں بھی خوش ہوتی ہوں
 چھپکلی کی رینگتی انگلیاں

 اب میرے بدن کو رہائی دے چکی ہیں
 یہ تماشہ ہفتے میں ایک دفعہ تو ضرور ہوتا ہے!

برگد، فاختہ اور میں

لارنس گارڈن، کریم ملن اور کینڈی میں
 بوڑھے برگد کے نیچے لٹکتی ہوئی داڑھیاں
 اور پرچھیلی شاخوں میں جھولتے پرندوں کی
 چپچھاہت، آج کا صحیفہ کھوتی ہیں
 اور بوڑھی لٹکی داڑھیاں ہڈ بیتی سناتی ہیں
 سناتی ہیں کہ گلابی لہراتے دوپٹے
 پینگ بھرتے بھرتے
 کسے سفید دوپٹوں میں تحلیل ہو گئے
 ریشمی خوابوں کی طنا میں ڈھیلی پڑتے پڑتے
 گانٹھیں باندھنے کے باوجود
 کوئی بھی وعدہ نبھانے کی دہلیز پہنہ آسکیں
 چنگیز میں رکھی تازہ روٹیوں کی طرح
 گرم لمس میں لپٹے بدن
 کب کے دھول میں اٹے سائے بن چکے ہیں

آج بائی اور بھوسلی رنگتوں کو پہنے
 اکیلے بیٹھے، یادوں کی جمع پونچی سنبھالتے
 سنبھالتے،
 نظر انھاتی ہوں، تو بوڑھی فاختہ میری طرح لگ رہی ہے
 برگد نے ہر کہانی کو اپنے بازوؤں میں لیا ہوا ہے
 بوڑھی فاختہ اور سائے میں بیٹھی میں اور وہ سب لوگ
 اپنی اپنی عمروں کی زنبیل کھولتے ہوئے
 گذرے ہوئے کل کے سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں)۔

شریعت کو نسل - عورت تم سے مخاطب ہے

تم بیان دیتے ہو
 دیتے ہی چلے جاتے ہو
 تمہارے سب بیانوں میں لپٹا ہوا
 عورت کا وجود ہوتا ہے
 کھانتے ہوئے بھی تمہیں عورت دکھائی دیتی ہے
 اور سوتے میں تم عورت کے ساتھ
 وہ پکھ کر لیتے ہو
 جس کے تمنائی ہوتے ہو
 پھر صح کو بیان تمہارے دماغ
 میں چپکا ہوا ہوتا ہے
 چار عورتوں کو منکوحہ بنانے کا خواب
 دیکھتے دیکھتے
 تمہاری داڑھی کے بال سفید ہو گئے ہیں

آنکھوں میں طلب کے ڈورے
 سرمه لگانے کے باوجود
 سرخ نظر آتے ہیں
 مگر عورت میں بھی ہوشیار ہو گئی ہیں
 سو کن کا نام سنتے ہی
 ان کے ہاتھ تلوار بن جاتے ہیں
 تمہارا راستم زماں بننے کا خواب
 ادھورا رہ جائے گا
 تم بے شک عورت کے خلاف
 بیان دیتے رہو!

آمنہ بی بی^۱

تم ساری مری مال جائی
 پاگل پن اور غصے میں
 خود کو جلا لیتی ہو
 یوں نامرا دوں کے دل کی مراد
 برآتی ہے
 دیکھو تو وہ
 دیکھیں پکار ہے ہیں
 کہ تم راستے کا پتھر تھیں
 دن ہو کر بے نام رہو گی
 ہم نے تمہارے بدن کا لطف انٹھایا
 کون کم بخت ہو گا
 جو تمہارے کنوں کی پتی جیسے جسم کو
 مسلنا نہیں چاہے گا
 تمہیں پتہ نہ تھا کہ مرد کی جوانی

^۱ مظفر گزہ اجتوئی میں میری بیٹی جس نے جنسی زیادتی کے بعد خود کو جلا لیا تھا۔

جانور وال کو بھی نہیں چھوڑتی ہے
 تم تو نازک کل تھیں
 ہم شکر گزار ہیں تمہارے
 تم نے ہمیں مسرور بھی کیا
 اور داعرِ رسوائی کو
 خود پر ہی سر مر تسم کیا
 میں تمہاری ماں جائی
 اور میری جیسی ماں جائیاں
 سینہ کو بی کریں تو بھی
 اس زمانے کو
 اور کوتواں شہر کو
 کوئی فرق نہیں پڑتا ہے

میرے گھونگھٹ میری بھوک

روئی کا ایک لقہ
کتنا قیمتی ہوتا ہے
نہ ملے تو

ماں کا دودھ بھی سوکھ جاتا ہے
بچے کی آنکھیں، بھوک کے مارے
باہر نکال دیتا ہے
جانوروں کی پسلیوں کو بھی
زنگا کر کے
مردار کر دیتا ہے
زمین کی سوکھی چھاتی کو
موروں کے لئے بھی تنگ کر دیتا ہے
زردار لوگ تمہاری غربت اور بھوک
کا تماشہ دیکھنے آتے ہیں

۱۔ تحریر پار کر کے جو اے

ان کی آنکھوں میں
 نہ حیا ہوتی ہے، نہ غیرت
 گیلی مٹی کو تم نچوڑ کر
 حلق ترکرتے ہو
 تمہاری عورتوں کے گھونگھٹ دیکھ کر
 ہونقوں کی طرح صوبے کے سورما
 ان کا چہرہ ڈھونڈ نے لگتے ہیں
 خود کو سندھو دیش کا سپوت کہتے ہیں
 مگر دھرتی کی رسموں کو نہیں جانتے ہیں
 خدا نہ کرے وہ دن آئے
 کہ بھوک اُن گھونگھشوں کو بھی کھا جائے!

غروبِ آفتاب سے پہلے

میرے دل نے تہائی سے اکتا کر کہا
 چلو شادی کر لیں
 ہمیں، ہمیں، جشن منائیں
 زندگی کو یہ نہ بھولنے دیں
 کہ ہمارے مقدار نے عشق کو فراموش کر دیا ہے
 میں نے جھنجھلا کر کہا
 بھلا عشق کا شادی سے کیا تعلق ہے
 ہمارے ملک میں تو
 بغیر کسی عشق اور تعلق کے
 شادیاں ہوتی اور نبھائی جاتی ہیں
 اتنے میں پنگ کی چوں نکل گئی
 دل نے ہنتے ہوئے کہا
 بس رشتے بھی یونہی جھولتے رہتے ہیں
 تم تعلق کی گردہ باندھ کے تو دیکھو

رشتؤں کی پائنتی کتے رہو تو
 زندگی ہنسی خوشی گزر جاتی ہے
 مجھے اداسی کی دہلیز پر رکھے ہوئے
 وہ دیے یاد آگئے جن میں تیل ڈالنا
 میں ایک عمر سے بھولی ہوئی تھی
 اپنے ریقق دل کو تسلی دینے کے لیے
 بال بنائے اور دیے جلائے
 پر دروازہ بند تھا
 کونئی آتا بھی تو کیسے!

والپسی کا سفر

مجھ تک تمہاری صورت نہیں
 تمہاری سانسوں کی مہک پہنچ جاتی ہے
 باتوں کا تلاطم، انتظار کی دیواریں عبور کر کے
 یوں بہتا چلا آتا ہے کہ میں شرابور ہو جاتی ہوں
 مجھے رلانا تمہیں خوب آتا ہے
 لیکن تم مجھے اپنی بے خسی کی دیوار میں کبھی چن دیتے ہو
 اور کبھی دل داری کی آسودگی یوں پھیلاتے ہو
 کہ رات کی رانی کی سی مہک
 میرے سارے وجود میں بس جاتی ہے
 یہ ایک دن کا کھیل نہیں
 ہر روز کسی نہ کسی لمحے، کسی نہ کسی موڑ پر
 کسی کے موبائل کی لست میں
 تمہارا نام پڑھ کر
 تمہارے سانسوں کی مہک تلاش کرنے لگتی ہوں!

اصغر ندیم سید کا دائرہِ زیست

جب اس نے شاعری کے لفظوں کی جانب
 ہاتھ بڑھایا
 تو وہ بے خوف تھا
 اس نے عشق کی ایک نہیں
 ساری ریکھا میں پار کر لی تھیں
 اس وقت غالب کے بقول
 اب اس کو خط آنے لگا تھا
 وہ خواب کی دہلیز پار کر کے
 یہ سوچ رہا تھا
 وصال کے کہتے ہیں
 پانی کی اس لہر کو جو
 واپس نہیں لوٹی
 یا اس آئینے کو
 جس میں ہمیشہ کسی نہ کسی محبوہ کا عکس
 جھلک رہا ہوتا ہے

اب اس نے جوانی کو پکھانا شروع کیا
 نظمیں لکھیں تو حاکم بے مہار نے
 آتشیں لفظوں میں اُسے دھنکارا
 شہر بدر کر دیا
 اس کی جوانی نے پھونک مار کر
 ایسا شعلہ جوالہ بلند کیا
 کہ آمرؤں کی بے شرم آنکھیں
 بھی دھندا گئیں
 وہ سبیطِ حسن کا دلارا
 اور فیضِ صاحب کا چہیتا تھا
 عشق اور جنون
 دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے
 جنون اس سے ناظمِ حکمت کے انداز میں
 نظمیں لکھوا تارہ
 اور عشق نے عروی لباس پہن لیا
 اس نے شکر گڑھ سے لاہور کا سفر
 آنکھ جھکنے میں طے کیا
 انجیر کی خوشبو سے اس کی دونوں آنکھیں
 آسودہ ہوئیں
 بھٹکنے کی ہر کوشش میں
 فرزانہ سامنے کھڑی تھی

پھول کی مہک اڑنے سے پہلے
فرزانہ اڑگئی

اب اس کے پاس
دیوانگی، عشق اور جنون کے
سارے موسم، ایک خواہش بن گئے
دوسرا ہٹ کی خواہش
وہ اس تلاش میں
ننگے پیر بھی چلا
بند کو اڑ کر کے رویا بھی
بہت سی دیواریں اس کو
پناہ دینے کو آگے بڑھیں
اُسے تو زعفران کی خوبیو والی
وہ کھیت چاہیے تھا
جو پہلے پیلا اور پھر سنہر انگل
پہن لیتا ہے
بابا غلام فرید کو پڑھتی ہوئی
شیبا سما منے آئی
اس نے اداہی کو
گھر آنگن میں بدلا
مسکراہٹ کو دروازے پہ
آؤیزاں کیا

اور بیٹوں کو اپنی بغلوں میں
چھپا کر ایسے بھاگی
جیسے ہر نی اپنے بچوں کی حفاظت کرتی ہے
ہمارا شاعر، باعثی شاعر
وہ کبھی چاندگر ہن بنتا
تو کبھی دریا اور پیاس بن کر
سارے محکوم لوگوں کو
بولنا سکھانے لگا

موت نے اُسے لدکارا
گود میں آ کر بینٹھ گئی۔
شیبا نے زندگی بن کر
اُسے بچا لبا
آج بھی جب شاعری کہتی ہے
میں نے تمہیں جنا تھا
تم مجھے چھوڑ کر ٹیلی وژن کی
ستی روشنی کی طرف کیوں چلے گئے
وہ شرم سار ہو کر
نظم بنانے لگتا ہے
کبھی ادھیری، کبھی پوری
زندگی جھی تو ایسی ہی ہے۔

منځنی عورت

دنیا سوچتی تھی اور حیران ہوتی تھی
 کیا بھی سورج مغرب سے نکلے گا
 کیا بھی دانٹری سے گھاس کاٹتی عورت
 آسمان میں ستارہ بن کر چمکے گی
 کیا یہ بھی ہو گا کہ انگوٹھاں گا کے
 اپنا حق دے دینے والی عورت
 دنیا کے سامنے اپنا حق منوائے گی

وہ منځنی سی عورت
 جس نے حکمرانوں کو للاکارا ہو
 جس کی ایک آواز پہ
 باندی بندی عورتیں ہوں کہ
 اینٹوں کے بھٹے پہ
 غلام در غلام خاندان ہوں

ایے کھنچے چلے آئیں
جیسے رقص کرتی ہوا
جیسے جھومتی ٹہنیاں
جیسے خوشبو چھلکاتی بہار

اور وہ منحنی عورت
صلیب سے بھی انصاف کے
ترازوں کو اتر والیتی ہے
زمین پر راج کرتے
خداوں کو للاکارتی
بیڑیوں کو پازیوں میں بدلتی
درویشی کی چادر اوڑھے
تعزیرِ سیاست کے پردے چاک کرتی
واعظوں اور فتویٰ فردوشوں کو
بنے نقاب کرتی
خزاں زده چہروں کو
بہاریں پہناتی
مسکراتی رہتی ہے

وہ منحنی عورت
آستینیں پہ قاتلوں کے
بے رحم نشان تلاش کر لیتی ہے

دیوارِ شب میں ایسے زند
لگاتی ہے
کہ صحیح بے چین ہو کر
اپنادر واکر دیتی ہے
ضبط کی دہنیز خاموشی کے لئے
ہزار سجدے کرے
مگر وہ تو اس آواز میں
بات کرتی ہے
کہ اس کی بازگشت عالمِ عالم
معتبر نہ ہرتی ہے

سلام اے منخنی عورت
تو نے اس ملک کے اندر ہیرے میں
قندیل روشن کی ہے
وفا کی، صلابتِ حق کی
ہمتِ کفر اور جذبہِ عوام کی
دنیا سوچتی تھی
کیا کبھی سورجِ مغرب سے نکلے گا
دنیا دکیھے لے سورجِ مغرب سے نکلا ہے
اے منخنی عورت! ساری دنیا تجھے سلام کرتی ہے!

یادش بخیر

نجمہ!
 تم اک دیا تھیں
 جس کو ہم نے مٹی کے پر دکر دیا ہے
 پہلے زمین پر تمہارے ذہن سے روشنی تھی
 اب مٹی میں زمیں کے نیچے بھی
 روشنی ہوگی
 مجھے معلوم ہے
 چھوٹے چھوٹے پودے تم سے مشورہ کر کے
 لبے ہوں گے
 اور مجھ دلیاں تمہارا پتہ معلوم کرنے کو
 ساحل کی سمت آئیں گی
 وہ سارے بے زمین لوگ
 جو تمہارے پاس مدد مانگنے کو آتے تھے

ان کو رستہ بتائے بغیر تم چلی گئیں
 مگر وہ مایوس نہیں ہیں
 انہیں تمہارے سکھائے ہوئے سارے سبق یاد ہیں
 ہمیں بھی نجمہ! تمہاری ساری دوست
 تمہارے تحکمانہ فقرے پیار سے یاد کرتی ہیں
 نجمہ!
 تمہارے چلے جانے کے بعد بھی
 دہشت گرد بہت خون آلو دپنجے
 ہمارے اندر گاڑ رہے ہیں
 تم زندہ تھیں، جب ہمارے پھول سے
 بچوں کو مسل دیا گیا تھا۔
 یہی غم تمہیں ان بچوں کے پاس لے گیا
 شکر ہے، ان کو ایک ماں مل گئی
 شکر ہے نجمہ! تمہیں نہیں نہیں دوست مل گئے!

زندگی نامہ

ایک عمر ہوتی ہے
 رتی گوں کے میلے میں
 آنکھ ہی نہیں لگتی
 بات میں بنسی اور
 بنسی میں باتوں کا
 سلسلہ نہیں تھمتا
 خواب بنتے رہتے ہیں
 دن مہکتے رہتے ہیں
 آئینہ بدن بن کر
 مسکراہٹیں جا گیں
 دصل کے تصور سے
 سرخ سرخ گالوں پہ
 یہ حجاب کی لہریں

نام بوجھ لیتی ہیں
 یاد بھی دلاتی ہیں
 انگلیوں کی پوری سبھی^{للھتی}
 اس کا نام ہے

غم ریڑھیاں چڑھ کر
 پھر شفق میں ڈھلتی ہے
 شام میں ٹھہرتی ہے
 سانس کے تموج کو
 حوصلہ دلاتی ہے
 زندگی کے گزرے پل
 نقشِ خواب تھے لیکن
 اب مٹے مٹے سے ہیں
 انگلیوں کی پوری سبھی^{لگتی}
 بے نشان گلتی ہیں
 وصل کے گماں لمج
 نام بھی نہیں لیتے

اب ہوا کے پردے میں
 رات اوڑھے پڑھی ہے
 نامرا دیا دوں کو

جو کے پھر یاں بن کر
ہونٹ پہ چیلکتی ہیں
میندگولیاں کھا کر
میرے پاس آتی ہے
عمر دیکھتی سے سب
بھولنے کی کوشش میں
پیر سونج جاتے ہیں

وہ جو جانِ جاناں تھا
وہ جو محرمِ جاں تھا
اس کا وہ گھر وندابھی
بے چراغِ دکھتا ہے
عمریوں گذرتی ہے۔

مجھے بن پانی مجھلی نہ بنا

مرے صدیوں پچھڑے ماجھی رے
 مری بے پتوار کی کشتنی کو
 تو نے کن لہروں کے ہاتھوں میں
 طوفان تماشہ رزق کیا

تجھے یاد دلاؤں ماجھی رے
 مری صدیوں پھیلی نسلوں نے
 کبھی برقعہ پہن نہ دیکھا تھا
 مری چادر، تیری عزت تھی
 مری دھرتی، تیری چاہت تھی
 مرائٹو ٹاپھونا پچھپڑ بھی
 مرا گھر تھا، تیری جنت تھی

میں پیتا راگ سناؤں کیا
 میں نُر سا گرد کھلاؤں کیا
 مرے نخجے بالک ڈرتے ہیں
 انہیں خواب سفر کرواؤں کیا
 وہ دار و رسن بھی دیکھے چکے
 انہیں ہمت نام سکھاؤں کیا

مرے ماں بھی رے
 تو گردن گردن کائے گا
 سوچا بھی نہ تھا
 تو پہلو پہلو مارے گا
 سوچا بھی نہ تھا
 تو آنکھ سلامی پروئے گا
 سوچا بھی نہ تھا
 تو قبر بنا اتر آئے گا
 سوچا بھی نہ تھا

مرے ماں بھی رے
 میں رب سے بھی کچھ کہہ نہ سکوں
 مجھے بن پانی مچھلی نہ بنا
 میں بن محرم کے رہ نہ سکوں
 مجھے وہ مسجد، منبر نہ دکھا

مرے مانچھی رے
 انکار کی ہمت کرتو سہی
 احساسِ ہزیمت کرتو سہی
 مرے سورج کو اندھامت کر
 مرے نام کی حرمت کرتو سہی
 مرے بچوں کو خود کش نہ بنا
 مرے ملک کی عزت کرتو سہی
 مرے مانچھی رے!

خوزے سے کارلوس کو رو نیل

قیدِ تہائی

قیدِ تہائی میں

وہ بازو صڑوتے اور جگہ جگہ مارتے
لگتا تھا میری بڈیوں میں تن بستہ کیڑا چل رہا ہو
یہ تاریکی ہے

ما تھد دیوار پہ بندھے ہوئے
نگمیں الگ الگ

تمہارے ساتھی کوں ہیں
ایک آواز گھونسوں کے ساتھ آتی ہے
میری کمر پر گرم طوفان ابلتا ہے
جیسے نوکومن کی گرمیوں کی پیش

اے ارجناں کے نائب ہو جانے والے لوگوں کی نغمیں

میرے ہونٹوں پر خوف
جیسے گلیوں میں بھرا اپانی
جس میں کاغذ کی کشمکش ہانپ رہی ہوں
زخم خورده ہنسی میرے ساتھ نہارہی ہے
سائس روکنے والے تیل کے ساتھ !

قیدِ تہائی میں
وہ سپاہی جو مجھے دیکھ رہے ہیں
ایک دوسرے کو بتاتے ہیں
اپنی چمکتی آنکھوں سے
بے چینی کے ساتھ مجھے گھورتے ہیں
اپنے ہتھیاروں کا رخ میری جانب کر دیتے ہیں
پھر بھی میں ان سے بات کرتا ہوں
وہ میرے قریب آ جاتے ہیں
اور سمجھ جاتے ہیں کہ ہم تو ایک جیسے ہیں

مگر پھر رات آ جاتی ہے
اب وہ میرے پاس آ کر پوچھتے ہیں
کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے
یہ کہتے ہوئے وہ میرے کپڑے پھاڑ ڈالتے ہیں
سردی میں مجھ پر اور کپکی طاری ہو جاتی ہے

دہشت ناک زردی مائل خنکی
 میں خود کو ان کی جبراً موجودگی میں
 نامرد سمجھنے لگتا ہوں
 اس لمح، ایک اور مرکا، ایک اور جھٹکا
 لگتا ہے میری جلد پر تیزاب پھینکا جا رہا۔ ہے
 وہ اور میں
 اکٹھے ہی چھنتے ہیں
 میرا جسم درد اور کراہیت سے دوہرا ہو جاتا ہے

قیدِ تہائی میں
 کس کی جانب سے تمہاری طرف سے
 میرے اوپر جبر کرنے والوں کی طرف سے
 میرے بھائیوں کی طرف سے
 وحشی چھوٹے آدمیوں کی طرف سے
 وہ کھلیتے رہتے ہیں
 میری موت سے بے خبر
 جیسے مجھے موت آئی ہی نہیں
 مجھے دھکوں اور مگوں کے ذریعہ
 زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں
 انہیں موت کی قطعیت کا اندازہ بھی نہیں
 میرے کوندوں کی طرح لپکتے دماغ کو بھسم کرنے
 وہ دونوں انٹھا کر مجھے پنج دیتے ہیں

قیدِ تہائی میں

کس سے، خدا سے

ناگزیر فتح سے

یہ لرزتے ہوئے چھوٹے سے آدمی

ہم نے انہیں بتانے کا تھیہ کیا ہوا ہے

کہ عربیاں آداب، رکوع، جن کا وہ سماں را

لیتے ہیں

وہ بھی خود کشی کے متراծ ہیں

کیونکہ ہمارا عہد

بارش کی طرح آنے گا

ہری، شاداب، قطعی سرحدوں

کے انعام کے ساتھ !

انا ماریا پونے

خود کلامی

میرے بچے اگر میں تمہیں نظر نہ آؤں
 مجھے تم سے کہنا ہے کہ یاد رکھنا
 میں نے تمہیں پیدا کیا تھا
 اپنے پیٹ کے اندر
 میں نے تمہیں زندگی کی بہترین سہولت دی
 میرے خواب، میرے کلیج سے لگے بچے
 میں اور تم ایک رہے ہیں
 تمہارے باتحو میرے باتحوں سے
 اور تمہاری آنکھیں میری آنکھوں سے بنی ہیں
 میں نے تمہارے وجود کو اپنی محبت سے
 گوندھا تھا
 میں نے تمہیں پیدا کیا

تمہارا باپ اور میں
 تمہیں بازوؤں میں لیتے تھے
 تم مستقبل کے بچے ہو
 میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں
 ہر چند تمہیں مجھ سے چھین لیا گیا
 میں تم سے الگ نہیں ہوں
 ہر رات خواب میں تمہیں تلاش کرتی ہوں
 میں تمہاری مسکراہٹ، آنسو اور بغل گیر ہونے کی
 سرست کو یاد کرتی ہوں
 وہ سارے بو سے جو تم مسکرا کر
 اپنی نیلی ہری آنکھوں سے ارزائ کرتے تھے
 اب تم میرے پاس ایک فونو کی شکل ہی ہو
 رات پڑتے ہی تم سے ملاقات ہوتی ہے
 مجھے لگتا ہے، میں دوبارہ زندہ ہو گئی ہوں
 پھر صحیح ہوتے ہی، فاصلہ قائم ہو جاتا ہے
 خطرناک حد تک کی بے یقینی اور مسلسل اداسی
 مجھے رُلا دیتی ہے، یہ مرحلہ بار بار آتا ہے
 میرے ننھے! میں نے تمہیں اتنا پیار کیا ہے
 کہ تم سے جدا ہی شاق گزر رہی ہے
 تمہارے ننھے ننھے ہاتھ میرے کندھوں پر
 پھر میں تمہارے ہونٹوں کو بوسہ دیتی تھی

تمہارے رخسار، میرے گالوں سے مل جاتے تھے
 تمہاری نئی آواز، ٹونے پھول لفظوں میں
 مجھے پکارتی تھی
 پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے
 تم مجھے یاد نہیں کرتے ہو گے
 اب وہ نہ چہرہ میرا رہا ہے
 اور نہ ساتھ
 پتہ نہیں کتنی مدت کے بعد
 ہم مل بھی سکیں گے
 اگر نہیں تو تم مجھے دھنڈ لی یادوں کے ساتھ
 یاد رکھنا!

او سولڈو ڈومینکو بالی

ایک مقید شہر کے لیے

ہم وہی ہیں بیونس آئرنس
 اور بہت سے دوسروں کی طرح
 یہاں آ کر، ہم لوگ
 تمہارے بارے تیس باتیں کرتے ہیں
 تمہاری جیلوں، کلیساؤں اور
 حکومتی عمارتوں کو سمجھنے کے لیے
 جو کیڑوں سے بھری ہیں
 اور ہم انہیں تباہ کرنا چاہتے ہیں
 ہم تمہارے اتواروں، سینماؤں
 بسوں اور چمنیوں
 تمہارے چوروں کے ٹھکانوں

تمہارے طوائف زدہ شہر کی
بیٹھتی ہوئی گلیوں کو
دریافت کرنے کے لیے آئے ہیں

تمہاری روح تو نباتات کا باع غنیٰ
جبکہ نیون سائنس لگادیے گئے تھے
اور وہاں پھول کھانے سے پہلے ہی
مر جھا گئے تھے

اگر تم بغیر مسکراہٹ کے پیدا ہو
تو تھے پیٹ بنانے والے
تمہارے لیے چمکتی ہوئی مسکراہٹ بنادیں گے
اس کی نمائش مہمانوں کے سامنے کریں گے
اگر تمہارے اندر خون نہیں ہوگا
تو وہ تمہاری پیاس کو لا مشرود بے
بجا میں گے
وہ تمہاری راتوں، درختوں اور ہر جگہ
 حتیٰ کہ ہوا کا وہ حصہ جو تمہاری طرف
 آتا ہے

آسمان کا وہ ٹکڑا جو تمہیں عزیز ہے
اس کو چھیننے کی کوشش کریں گے

مگر وہ تمہارے گرم سرخ دل کی گرماش
کو چھین نہیں سکیں گے
یہ تو مستقبل کا شہرِ سرت ہے
یہ عظیم بندرگاہ ہے
ہمارے کسانوں، مزدوروں کے
جمہوری ملک کے لیے۔

ایڈران رچ

مشکل لفظوں کی اٹلس سے

مجھے اندازہ ہے
 تم نے اسی نظم کو بہت دیرے سے پڑھنا شروع کیا
 دفتر سے روانہ ہونے سے پہلے
 اندر ہرے میں گم ہوتی ہوئی عمارت کی
 ٹیکاں سی کھڑکی کے نیچے
 گہرے زرد لیمپ پوسٹ کے پاس
 جب کہ چھٹی کا وقت
 خاموشی میں تبدیل ہو چکا تھا

مجھے معلوم ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
 اس کتابوں کی دوکان میں
 جو سمندر سے بہت دور

بہار کے اولین موسم کے ملکجے سے دن
ہوا مہین ذریں کوتہمارے اردگرد
وسعی میدان میں اڑائے پھر رہی ہے

مجھے معلوم ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
جہاں تمہاری برداشت سے زیادہ
بہت کچھ ہو چکا ہے
جہاں بستر کی چادریں
کٹھڑی کی شکلوں میں پڑی ہیں
ایک کھلا ہوا بغنجہ تمہیں یاد کر رہا ہو گا
کہ تمہیں روانہ ہونا ہے
مگر تم ابھی نہیں جاسکو گے

مجھے معلوم ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
جیسے گراونڈ ٹرین کی تیز رفتاری
مندل ہوتی ہے
اور سٹریھیوں کی جانب بھاگتے ہوئے
اک نئے طرز کے عشق کی جانب
جس کی تمہاری زندگی نے کبھی اجازت نہیں دی ہے

مجھے معلوم ہے تم یہ نظم
ٹیلی وژن کی اسکرین کی روشنی میں پڑھ رہے ہو

جہاں بے آواز شکلیں آ جارہی ہیں
 اور تم انتظار کر رہے ہو انفاضہ کی خبر کا
 مجھے معلوم ہے تم یہ نظم
 ایک انتظارگاہ میں بیٹھ کر پڑھ رہے ہو
 جہاں اجنیوں سے کہیں آنکھیں ملتی، کہیں گریزاں رہتی ہیں
 مجھے معلوم ہے تم یہ نظم فلا ریسینٹ لائٹ میں پڑھ رہے ہو
 کہ نوجوانوں کی بوریت اور تھکاوٹ کہ جو بہت ہی نو عمری میں
 اپنے آپ کو شمار بھی کرتے ہیں اور نہیں بھی کرتے

مجھے معلوم ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
 کمزور نظر ہونے کے باعث
 مخدب شیشوں کی مدد سے
 پڑھ رہے ہو
 ان لفظوں کو وسعت دے رہے ہو
 ہر چند مطلب سمجھ میں نہ آئے
 تم پڑھے جاریے ہو
 کہ حروف بھی قیمتی ہوتے ہیں

مجھے معلوم ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
 اسنود پہ دودھ گرم کرتے ہوئے
 ایک روتاب پہ تمہارے کندھے پر ہے
 اور ایک کتاب تمہارے ہاتھ میں ہے

کیونکہ زندگی مختصر ہے
اور تم بھی پیاسے ہو

مجھے پتا ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
کہ جو تمہاری زبان میں نہیں ہے
کچھ لفظوں کا اندازہ لگاتے ہوئے
باقی کو ایسے ہی پڑھ لیتے ہو
میں جاننا چاہتی ہوں
وہ کون سے لفظ ہیں

مجھے پتا ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
ایسی چیز سننے کے لیے
جو امید اور تمنی کے درمیان ابھی ہوئی ہو
پھر اس کام کی جانب متوجہ ہوتے ہو
جس سے تم انکار نہیں کر سکتے ہو

مجھے پتا ہے تم یہ نظم اس لیے پڑھ رہے ہو
کہ تمہارے پاس پڑھنے کے لیے
کچھ اور نہیں ہے
جهاں کہ تم موجود ہو
ہنگامہ خیز! جیسا کہ تم ہو

غزل

تجھ سے وعده، عزیز تر رکھا
وہشتوں کو بھی اپنے گھر رکھا

اپنی بے چہرگی چھپانے کو
آئینے کو ادھر ادھر رکھا

اک تراغم ہی اپنی دولت تھی
دل میں پوشیدہ بے خطر رکھا

آرزو نے کمال پہچانا
ہر تعلق کو طاق پر رکھا

اس قدر تھا اداس موسمِ گل
ہم نے آپ رواں پر سر رکھا

اپنی وارثگی چھپانے کو
شوق نے ہم کو در بدر رکھا

کلمہ شکر کہ محبت نے
ہم کو تمہیدِ خواب پر رکھا

اُن کو سمجھانے اپنا حرفِ سخن
آنسوؤں کو پیامبر رکھا

غزل

یاد رکھو گے کہ اس گھر کے مکیں ہم بھی تھے
 جب زمیں پوچھے گی کہنا کہ یہیں ہم بھی تھے
 ایک موہوم سا رشتہ ہے سورکھنا اس کو
 تم جہاں جاؤ، سمجھ لینا وہیں ہم بھی تھے
 دفن کرنا کسی دیوار کے سائے میں دعا
 یاد کر کے کہ مرادوں کے امیں ہم بھی تھے
 نہ کوئی عرض گزاریں گے جو ہوں گے رخصت
 کون سمجھے گا تھہ خاک نشیں ہم بھی تھے

غزل

ہم نے غم کھینچا تھا، ایذا طلبی کم نہ ہوئی
 دل میں طوفان نہ رکا، در بدری کم نہ ہوئی
 ہم نے رسوانی بھی پہنی، تجھے رسوانہ کیا
 اے مرے شہر تری بے خبری کم نہ ہوئی
 دل کی دہلیزِ مٹی، در نہ رہا، گھرنہ رہا
 فتنہ سامانوں کی پر فتنہ گری کم نہ ہوئی
 قصہ خوانی کہیں کی اور کہیں ڈھونڈا اس کو
 جل بجھے داغ، پہ آنکھوں میں نمی کم نہ ہوئی
 ہم تو طوفان بے دل رکتے رہے، چلتے رہے
 پیاس بجھتی ہی رہی، تشنہ لبی کم نہ ہوئی
 فاصلے کم نہ ہوئے، شوقِ سفر کم نہ ہوا
 اس سے ملتے رہے، بیگانہ روی کم نہ ہوئی

غزل

التزاماً کوئی حواہش نہیں کی جا سکتی
 خانقاہوں میں تو پر ش نہیں کی جا سکتی
 اب اجازت ہی کہاں ہم کو خن کرنے کی
 بولنے کے لیے کوشش نہیں کی جا سکتی
 تو نے دریاؤں کو صحراؤں میں بدلا ہے بہت
 آسمان تجھ سے سفارش نہیں کی جا سکتی
 یا خدا خواب بنادے مجھے بلکا کر دے
 یہ نہ کہنا کہ یہ بندش نہیں کی جا سکتی
 وہ جو شیطان کی طرح زخم بناتے جائیں
 ان خداوں کی پرستش نہیں کی جا سکتی
 مانگتا کیا ہے فلک، چشم فراموشی سے
 زخم اتنے ہیں کہ جنبش نہیں کی جا سکتی
 ڈھونڈتے کیا ہیں گلتاں میں رہا کچھ بھی نہیں
 اس خرابے میں تو شورش نہیں کی جا سکتی

غزل

اجلی شام میں لپٹا وعدہ تازہ، میرے اندر تھا
 باہر کیسے جاتی میں، دروازہ میرے اندر تھا
 شام کو صبح میں، صبح کو شام میں، خود ہی میں نے بدلا تھا
 ہر نجیگیر کا گویا ہر خمیازہ میرے اندر تھا
 حرف تراشے تھے میں نے اور تم نے خرید لیے تھے
 صد یوں تک جیسے پھیلا شیرازہ میرے اندر تھا
 قفلِ محبت مجھ سے کیا، وہ تم سے بھی تو کھلانہیں
 یوں تو شیشہ جاں کا ہر اندازہ میرے اندر تھا
 آنکھیں دشت کی صورت ہوئی ہیں، جب سے رستے جدا ہوئے
 ویسے گنبدِ شوق کا ہر آوازہ میرے اندر تھا
 بھول نہیں سکتی وہ ساعت، وہ منظر کسی عالم میں
 شام شفق تھی اور بکھرتا غازہ میرے اندر تھا
 ساری بستی سوگوار تھی، جب لفظوں کی موت ہوئی
 گور پڑا تھا کوئی اور، جنازہ میرے اندر تھا

غزل

میں سرکشیدہ رہی، عمر بھر سجھاتے رہے
 وہ لوگ جو مرے رستے میں آتے جاتے رہے
 میں آبجو تھی، سمندر نہ بن سکی اور لوگ
 قیاس کرتے رہے، داستان بناتے رہے
 کوئی نہ تھا مرا خورشید جو بجھا سکتا
 مرے قریب جو آئے جھلس کے جاتے رہے
 مصاہب تھی، رفاقت تھی، سب ہیوں لے تھے
 یہ سانچے مری دہنیز کو سجاتے رہے
 ہوانے کاٹ دی تحریر میرے اشکوں کی
 یہ داغ دل میں نیا آشیاں بناتے رہے
 ہجومِ دل زدگاں میرے ساتھ چلتا رہا
 ہوا کے ہاتھ ہی تصویرِ جاں بناتے رہے

غزل

وہ عجب عہدِ وفا تھا کہ جدا تھے ہم لوگ
 زندگی تیرے تماشے سے سو اتھے ہم لوگ
 کون طوفان بدن آن کے ٹھبرا دل میں
 رقصِ شعلہ تھے، کہیں موج نما تھے ہم لوگ
 اب ہیں دلیز پڑھرے ہوئے زخموں کے نشاں
 ورنہ تو خواب زمانوں کے خدا تھے ہم لوگ
 کبھی امید حوالہ تھی کبھی پیاسِ حشم
 دامنِ خواب کہ صحرائی ردا تھے ہم لوگ
 وہ ٹھہرتا بھی کہاں اور کسے اپنا کہتا
 آتی جاتی ہوئی لہروں کی صد اتھے ہم لوگ

رنج کو ضد تھی کہ ہمزاد ہی بن کر جینا
 اس لئے گلشنِ جاں، آبلہ پاتھے ہم لوگ
 ہم سے رشتوں کی تمازت نہیں جھیلی جاتی
 ہم سے بیگانہ ہی رہیو کہ ہوا تھے ہم لوک
 منزلیں راستہ پوچھیں، وہ مسافر ہم تھے
 آسمان ڈھونڈنے نکلے، وہ دعا تھے ہم لوگ

غزل

جذب کر لیتے ہیں ہر دکھ کو سمندر کی طرح
 اے مرے خواب ٹھہر جا کسی گوہر کی طرح
 اپنی دیوانگی سونپی نہیں دیواروں کو
 خلوتِ جاں میں رہے شہرِ معطر کی طرح
 گردشیں اپنا مقدار تھیں تو ملتیں کس کو
 زندگی تجھ کو گزارا بھی ہے پھر کی طرح
 آئینہ ہے کہ جو باور نہیں کرنے دیتا
 اس کی قربت کو کسی گل کسی عنبر کی طرح
 اک دیا ہاتھ میں ٹھہرا رہا، جلتا بھی رہا
 ہم نے اپنایا ترا زخم صنوبر کی طرح

ہم نے مایوسیاں پہنی نہیں پھر بھی دل میں
وہ خہرتا ہی نہیں آ کے مسافر کی طرح
موح کی طرح کبھی مجھ سے لپٹ جاتا ہے
اور گریزاں ہے کبھی قطرہ محسوس کی طرح
مجھ کو اندازہ نہ تھا تیری طلب کا ورنہ
میں اتر جاتی ترے دل میں سمندر کی طرح

غزل

وہ اگر آئے تو پھر دل میں تماشا ہو گا
 بات کرنے کے لیے کوئی فسانا ہو گا
 شام ہو گی تو پکارے گی مجھے آنکھوں میں
 کہکشاں ہاتھ میں ٹھبرا ہوا رستا ہو گا
 زخم آنکھوں کی کہانی نہیں کہنے دیتے
 پھر مرا عہدِ تمنا یونہی رسوا ہو گا
 اے مری گمراہی، تو گودِ اداسی کونہ لے
 ورنہ تجھ سے بھی کہاں کوئی مداوا ہو گا
 وہ تو آئے گا دبے پاؤں گزر جائے گا
 جانکنی ٹھہر کہیں تو کوئی رستہ ہو گا
 اس کی خوشبو، ہی مجھے دشت میں بہلاۓ پھری
 جس کے سائے کو میں سمجھی تھی سراپا ہو گا

غزل

دل نے چاہا تھا کہ ہو آبلہ پائی رخصت
 زندگی دیکے ہوئی شعلہ فشانی رخصت
 تم نے جب شمع بجھائی تو سمجھ میں آیا
 ایک موہوم سارشته تھا، سو وہ بھی رخصت
 میں اداسی سرِ بازار بھی لاڈ ایسے
 جیسے پانی کی تمنا میں ہو کشتی رخصت
 میرے اصرار پہ موجود تھا گھر پہ لیکن
 اس نے خاموش لباسی میں لکھی تھی رخصت
 تیری تائید کی تصویر سے جی اٹھے تھے
 نہیں معلوم تھا، یہ ریت ہے، پانی رخصت
 میں حوالہ تری تحریر کا کس نام سے دوں
 مجھ سے تو مانگ چکا حرفِ تعلیٰ رخصت

غزل

خوش بیاباں میں مگر شہر میں ڈرنا اس کا
 کاسہ ہاتھوں میں لیے گھر میں بھی پھرنا اس کا
 دل ڈکھا کے کبھی ہنسا، کبھی رونا اس کا
 میرے آنکھ میں لکھا تھا نہیں بنا اس کا
 اس نے تہائی میں بھی انجمن آرائی کی
 چاند نے دیکھ لیا آنکھوں کو بھرنا اس کا
 میں نے دیکھا ہے سرِ شام اُداسی کا خرام
 پاؤں میں چھالے پہن کے نہ ٹھہرنا اس کا
 آئینہ دیکھنا منظور نہیں تھا اس کو
 لطف دیتا تھا ہوا بن کے گزرنا اس کا
 ہر خلش آن کے رکتی تھی مری بانہوں میں
 زندگی دیکھتی رہتی تھی تڑپنا اس کا
 ہے عجب طرزِ ملاقات، عجب طرزِ سفر
 پاس آ کے نہ ٹھہرنا نہ گزرنا اس کا

غزل

ہم نے کہنے کو تمہیں دل سے بھلا کیا ہوا ہے
 بس یہی داغ ہے، سینے میں چھپا کیا ہوا ہے
 اب گرے گی بھی تو کیسے کہ بہت صبر کے ساتھ
 ہم نے دیوار کو ہاتھوں سے بنایا ہوا ہے
 بات کرنے کو بہت دیر سے سوچا، اس سے
 جس کی تحریر کو آنکھوں میں بسا کیا ہوا ہے
 چشم بے عیب میں اس کا ہی سراپا کیوں تھا
 جس کا غم، حدِ تمنا میں سما کیا ہوا ہے
 خواہشِ قرب کے پوند ہیں ہاتھوں میں مرے
 اے جنوں زادِ مجھے کتنا ستایا ہوا ہے
 کوئی کہتا ہے رفاقت نہیں ملنے والی
 کوئی کہتا ہے وہ دلبیز پہ آیا ہوا ہے
 وصل کی شام کا اندازہ بہت مشکل تھا
 ہم نے پوچھا تھا مگر اس نے چھپا کیا ہوا ہے

غزل

شام بانہوں میں لیے رات کی رانی آئی
 اے محبت تجھے دینے کو سلامی آئی
 تشنگلی اتنی کہ دریا ہے مری آنکھوں میں
 نا شناسا ترے ہونے کی گواہی آئی
 جس سے منسوب ہوا میرے خیالوں کا سفر
 ڈھونڈنے اس کو مرے ساتھ ہوا بھی آئی
 مجھے میں موجود ہے وہ اور نہیں ہے ظاہر
 اس کی خواہش در و دیوار بناتی آئی
 زخم ایسا تھا ٹپکتا تھا لہو آنکھوں سے
 دل بیاں کرنے سکا ایسی تباہی آئی
 پرش حال کرے کون کے ہے فرصت
 کب مرے صحن میں نادیدہ خدائی آئی

غزل

دیوار و در میں غم کا تماشہ تو ہے ابھی
 وہ خود نہیں پہ اس کا بلاوا تو ہے ابھی
 مانوس ہو چلی ہے اداسی سے زندگی
 پاؤں کے آبلوں کا نظارا تو ہے ابھی
 پچ ہے کہ زہرِ عشق، تلطف گریز تھا
 چنگاریوں نے ورنہ پکارا تو ہے ابھی
 خوابوں کو در بدر ہی رکھا تھا نصیب نے
 آشناستگی میں جاں کا خسارا تو ہے ابھی
 معلوم ہے کہ کچھ بھی نہیں دشتِ زیست میں
 امیدِ خواب ہی پہ گزارا تو ہے ابھی
 رخصتِ شبِ فراق! بہت سہہ لیا تھے
 ہمراز گرچہ خواب ستارا تو ہے ابھی
 بے تابیاں سمیٹ کے پوچھا کرے ہے دل
 قسمت میں اپنی صبح کا تارا تو ہے ابھی

غزل

تجھ سے بہت قریب بھی، تنہا بھی تھے ہمیں
 تھے آبروئے عشق پر رسو بھی تھے ہمیں
 آنکھوں میں خون تھا کہ زمیں تھی لہو لہو
 زنجیرِ غم پہن کے تماشا بھی تھے ہمیں
 ہر ہر قدم پر اک نئی دیوار تھی کھڑی
 اس رات کے سفر میں، اجالا بھی تھے ہمیں
 معلوم تھا یہ عشق نہیں، مات کا ہے کھیل
 پسپا ہوئے تھے ہم ہی، حوالہ بھی تھے ہمیں
 معلوم تھا کہ وحشتیں اپنی بساط ہیں
 معلوم تھا کہ شام کا تارہ بھی تھے ہمیں
 آنکھوں میں خواب چھتے رہیں گے تمام عمر
 یہ درد لا دوا تھا، مسیحا بھی تھے ہمیں

اب یاد بھی نہ آؤ کے وعدہ بھی تھا یہی
 دشتِ بلا میں وعدہ فردا بھی تھے ہمیں
 اے صبحِ نو بہار کبھی تو ادھر بھی آ
 احباب جانتے ہیں کہ تجھ سا بھی تھے ہمیں

غزل

زخم بھی تازہ تھا اور اس پہ ہوا بھی تازہ
 دل نے رکھا تھا مگر رخشِ دعا بھی تازہ
 تر برہے مرے ہاتھوں میں وہی جامنی رنگ
 تم نے پوچھا تھا کہ ہوتی ہے گھٹا بھی تازہ
 اب تلک ہے وہی جلتا ہوا صحراء میں
 اب تلک ہے تپشِ شوقِ ندا بھی تازہ
 کس بہانے سے تجھے بھول رہوں اور خوش ہوں
 پھر بنا لے گا یہ دل ایک خدا بھی تازہ
 کس بہانے سے میں جاگوں، تجھے ڈھونڈوں اب کے
 اب تو اس صحن میں نہ ہوا بھی تازہ
 آئینہ مانگتا رہتا ہے وہی عکس ترا
 آنکھ رکھتی ہے ترا رنگِ قبا بھی تازہ
 بس بہت حوصلہ رکھنے کی کہانی کہہ لی
 رات کو پھول مسلتی ہے ہوا بھی تازہ

غزل

دل کی دیوار میں آئینہ رکھا تھا کس نے
 مجھ کو پہچانتے رہنے کو کہا تھا کس نے
 دشمنِ جا ترے باتھوں میں تو پتھر بھی نہ تھا
 لذتِ خواب کو نم دیدہ کیا تھا کس نے
 اب بہت دور نکل جانے کو جی چاہتا ہے
 مجھ کو جاتے ہوئے دیوانہ کہا تھا کس نے
 اس کی آنکھوں میں بلا وابی نہ تھا، پچ یہ ہے
 اے شبِ بحرِ تجھے ساتھ کیا تھا کس نے
 انجمنِ انجمن قصے تھے ہمارے کل تک
 آج ویرانی کو آنکھوں میں رکھا تھا کس نے
 نام تو اس کا بھلا ساتھا مگر یاد نہیں
 سکیاں لے کے تجھے یاد کیا تھا کس نے

غزل

مجھ کو دریزہ گرِ خواب بنا دیتا ہے
 جب بھی آتا ہے مری پیاس بڑھا دیتا ہے
 پوچھ لیتا ہے مرا حال وہ دیواروں سے
 اپنے ہی ہاتھ سے تصویر بنا دیتا ہے
 اس نے سیکھا ہی نہیں خواب میں رہنے کا سفر
 ایسا کوئی نہیں جو آکے جگا دیتا ہے
 شام ہوتے ہی سنورتا ہے مری آنکھوں میں
 یہ نظارہ ہی مجھے آگ بنا دیتا ہے
 آئینہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے مجھے آخر کار
 لطفِ تائید مجھے تجھ سے سوادیتا ہے

غزل

یہ دشتِ فراموشی تھبرنے نہیں دیتا
 لیکن درِ خواہش کو بھی کھلنے نہیں دیتا
 یہ رسم ہے دیوار و درِ گریہ کی لیکن
 دریوڑہ گرِ خواب تو رونے نہیں دیتا
 آشوب ہے ایسا کہ سراسیمہ ہے وحشت
 یہ عجزِ بیاں، زخم بھی دھونے نہیں دیتا
 ہاں منزلِ امید بھی نزدِ یک تھی لیکن
 غمِ خانہ جانا ناں بہلنے نہیں دیتا
 آنکھوں میں وہی رنجِ اسیری ہے مسلط
 جو حشر بپا ہونا تھا، ہونے نہیں دیتا
 بے نام رہی خواہش دیدار ہمیشہ
 شبنم کی طرح وہ مجھے ہنئے نہیں دیتا
 آنگمن میں لہو دیکھ کے روئی نہیں آنکھیں
 یہ دل تو سلگتا ہے پہ جلنے نہیں دیتا

غزل

کبھی بھلا یا نہیں، یاد بھی کیا نہیں ہے
 یہ کیسا جرم ہے جس میں کوئی سزا نہیں ہے
 میں بات بات پر رونے کا ماجرا پوچھوں
 وہ ہنس رہا ہے بتانے کو کچھ رہا نہیں ہے
 زمیں پر آہ و بکا اور خونِ ناحق بھی و
 زبانِ خلق یہ پوچھے ہے، کیا خدا نہیں ہے!
 کلام کرنے کو ناصح رہا نہ واعظ ہے
 میں کیا کہوں کہ مرے پاس بد دعا نہیں ہے
 بس اب تو آنکھ میں صحراء ہی جنم گیا آ کے
 سمجھ لو خواب بھی دہلیز پر رکھا نہیں ہے
 قدم قدم پر وہی تملقاتی خواہش ہے
 پیام لانے کو کوئی بھی دربا نہیں ہے
 مری اداسی مرے کام آ سکی نہ کبھی
 بس اب سوال بھی کرنے کا حوصلہ نہیں ہے
 رفیقِ خواہش موجودہ سن لیا تو نے
 چمن بہت ہیں مگر کوئی دیکھتا نہیں ہے

غزل

نغم کی تاکید بھی کی اور کہا شاد رہو
 یوں ہی مخالف میں رہو گرچہ تبہہ باد رہو
 گل فروشوں کی طرح رشتہ خوشبو نہ رکھو
 اس کو ہی بھولنا تھہرا ہے، جسے یاد رہو
 ہر جیس لالہ خوں سے ہے تپیدہ لیکن
 دل یہ کہتا ہے اسی کوچے میں آباد رہو
 چشم بستہ رہو، تعمیل وفا کرتے رہو
 حاکمِ شہر کی خواہش ہے قفس زاد رہو
 پہلے تو دلکیں دیتی تھیں دلاسے لیکن
 اب تو کہتی ہیں کہ در بندش صیاد رہو
 اپنی مکومی صدا دیتی ہے اور پوچھتی ہے
 حکم کس کا تھا کہ نا واقفِ همزاد رہو

غزل

میں طشتِ خواب لیے ہاتھ میں گزر گئی ہوں
 سمجھ سکا نہ وہ جس کے لیے میں گھر گئی ہوں
 بہت عجب تھی سمندر سے گفتگو لیکن
 پہن کے پیاس پلٹنے کا صبر کر گئی ہوں
 مرا مزاج رہا دشت آشنا شب بھر
 کہ دن میں بستیاں دیکھیں تو جیسے ڈر گئی ہوں
 حصولِ خواہشِ نایاب گرچہ ناممکن
 کسی کے وعدہ بے آب پہنچہ گئی ہوں
 بہت نہال ہے دل، آنکھ میں ہے سرمستی
 لگئے کہ شہرِ خوشِ انجام سے گزر گئی ہوں
 بلا سے بھول گئے وہ جو آشنا تھے کبھی
 میں آج اپنے شبستان میں بے خطر گئی ہوں

خوشائی پر یادوں کا قافلہ نہ برا
 خوشائے یادتھی ایسی خوشی سے مرگئی ہوں
 بہت عزیز تھا آشناقی کا پیراہن
 یہ جان کر دم آزردگی بکھر گئی ہوں
 سراب آسا رہا وہ تعلقِ خوباب
 پٹ پٹ کے بلا تا ہے، پھر بھی ڈرگئی ہوں

غزل

آغوشِ گل میں لذتِ صحبت نہیں رہی
 کس سے کہوں کہ قوسِ محبت نہیں رہی
 موجود ہوں بساطِ تمنا کے دشت میں
 پہلو میں آبروئے ہریمت نہیں رہی
 دیکھا اُسے تو قرضِ وفا یاد آ گیا
 باتوں میں اس کی خوئے ارادت نہیں رہی
 میں بھول کے بھی اس کی گلی میں نہ جاؤں گی
 پہچانتی ہوں دل میں مروت نہیں رہی
 شاموں کے سائے ڈھونڈنے نکلے تھے کل یہیں
 کہتے ہیں آج عشق کی مهلت نہیں رہی
 بکھرے ہوئے ہیں لفظ بھی، نوحہ گری کہاں
 دل میں ہواۓ خلوت و جلوت نہیں رہی
 اب بس کرو کہ آنکھوں میں پانی نہیں رہا
 اس زندگی میں اب کوئی تہمت نہیں رہی

غزل

کبھی سوچا نہ تھا اتنی بھی سرشاری کبھی ہو گی
 کہ تیرا نام پڑھتے ہی طلبگاری کبھی ہو گی
 کبھی روتے ہوئے بنس دوں، کبھی ہنستے ہوئے رو دوں
 کبھی محفل سجادوںگی، عزاداری کبھی ہو گی
 ستم ایجاد و دیواریں، جنوں اطوار ہی ٹھہریں
 ترے محفل میں آجائے پہ بیزاری کبھی ہو گی
 بہت معروف رکھا تھا، ترے خوابوں نے در پردہ
 سانا چاہیں حالِ دل تو دشواری کبھی ہو گی
 نہیں معلوم تھا غولِ رقیباں ساتھ چلتا ہے
 نہ کوئی حال پوچھیرے گا نہ غم خواری کبھی ہو گی

غزل

یہ بھی ممکن ہے کہ آنکھیں ہو، تماشا ہی نہ ہو
 راس آنے لگے ہم کو تو یہ دنیا ہی نہ ہو
 زندگی چاہیں تو خوابوں سے سوا کچھ نہ ملے
 ڈوبنا چاہیں تو حاصل ہمیں دریا ہی نہ ہو
 دل کو خوش کرنے کو ڈھونڈے ہیں بہانے ہم نے
 اب پلٹ کر ذرا رکھیں کہیں آیا ہی نہ ہو
 اب تو بس ساعتِ گم کردہ کی یادیں باقی
 یہ وہ جنگل ہے کہ جس میں کوئی رستا ہی نہ ہو
 کام کیا دیگا وہ ٹوٹا ہوا آئینہ بجی
 یاد رکھنے کو وہی عکس وہ چہرا ہی نہ ہو
 بھر کو شوقِ مداوا ہی سمجھ کر جی لیں
 زندگی تجھ سے اُنجھنے کا تو نیارا ہی نہ ہو



Rs. 400.00

www.sangemeel.com

ISBN-10: 9 69 - 35 - 2918 - 9

ISBN-13: 978-969-35-2918-0



9 789693 529180